غلام باغ میں فلسفۂ زمان و مکاں

محمد فاروق بیگ

Abstract:

What is time is an unsolveable question till now. After Aag ka darya Mirza Athar Baig repeated this question in urdu novel. Ghulam Bagh is 21st century novel in which different theories of time practised and discussed through Kabir Mehdi,the protagonist. Time and space is also practised in a beautiful way.

مرزا اطہر بیگ کا ناول اکیسویں صدی کے اردو ادب کا پہلا اعجوبہ ہے۔اردو ناول میں مرزا اطہر بیگ نے نیا رنگ روپ اختیار کیا ہے۔اس رنگ و روپ سے قاری، ناول نگار اور نقاد ششدر ہیں اور اس کیفیت سے اپنے آپ کو نکالنے کی کوشش میں ہیں۔آگ کا دریا کے بعد ایسے کثیر الجہت ناول کا شائع ہونا ایک اعجوبے سے کم نہیں۔ان کے ناولوں میں بیک وقت انتھروپالوجی (Anthropology) (علم الانسان)،علم نفسیات،فلسفہ،تاریخ، عمرانیات، آرکیالوجی (Archeology)، انگریزی ادب،ڈرامہ نگاری، آرٹ، بیالوجی، فزکس، کاسمالوجی (Cosmology) اور علم طب کے ساتھ ساتھ دیگر کئی علوم جذب نظر آتے ہیں۔ جب ہم غلام باغ، صفر سے ایک تک اور حسن کی صورت حال کا بار بار مطالعہ کرتے ہیں تو ہر دفعہ فکر و فن کے نئے منطقے دریافت ہوتے ہیں، ہیئت و تکنیک کی جہتیں وا ہوتی ہیں، اسلوب کے دریچے کھلتے ہیں،ابن آدم کی شخصیت کے پرت اترتے ہیں اور اس کی نفاست و غلاظت کو ننگا کر دیتے ہیں۔اردو ادب میں ایک patent فلسفی کے ناولوں کی آمد بڑی دلچسپ ہے۔زمان و مکاں کا ناول سے کیا تعلق ہے اور ناول زمان و مکاں میں مقید ہوتا ہے یا نہیں مزید یہ کہ اس بحث میں مصنف کا کیا مقام ہے۔مرزا اطہر بیگ اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''فکشن کے خالق کو خدا بننے کا اختیار کس نے دیا ہے۔اُس کی ہر افسانوی حرکت میں خدا بننے کا دعویٰ چھپا ہوا ہے اُسے ایسا عالم کل اور وقار مطلق بننے کا حق کس نے دیا ہے؟ وہ کسی بھی متنفس کے شعور حتیٰ کہ لاشعور کی گہرائیوں میں اُتر کر اُس کے بطون ذات کے جملہ اسرار کی خبر لاتا ہے

اور پھر زمان و مکان کی قید سے بھی ماورا ہو کر کائنات کے کسی بھی گوشے کسی بھی واقعے کی جزئیات بیان کرتا ہے اگر وہ کسی واحد متکلم کی ذات کو اختیار کرتا ہے تو پھر 'میں' کی اُس کھڑکی کی راہ سے، سب کچھ دیکھ لیے کا دعویٰ کرتا ہے۔''(۱)

ناول غلام باغ کے آغاز سے لے کر اختتام تک مصنف نے کوشش کی ہے کہ وہ ہر لمحے کو اپنی گرفت میں رکھے یا کم از کم اپنے کرداروں کی گرفت میں رہنے دے۔لیکن وقت جیسا کہ ہم جانتے ہیں کسی کی گرفت میں نہیں آ سکتا۔مرزا اطہر بیگ کے اس ناول میں وقت اپنی پوری شدت سے موجود ہے۔ناول کے آغاز سے اختتام تک ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک ہی لمحے کے قیدی ہیں اور پورا ناول اور اس کے کردار، واقعات، تار چڑھاؤ، ہیرو اور ولن سب اس لمحے کے قیدی ہیں۔جیسا کہ ہم غلام باغ کے پہلے اور آخری اقتباس میں دیکھتے ہیں:

''اسی لمحے میں دیکھو۔

'لمحہ؟ کیسا لمحہ؟' ڈاکٹر ناصر اچاٹ سے نیم سوالیہ انداز میں بڑبڑایا۔

وہ کھلی آنکھوں سے کچھ نہ دیکھنے کی کیفیت میں تھا۔

'ہاں.....وہ تم کسی لمحے کی بات کر رہے تھے۔'

ہاں کیا تھا وہ تمہارا۔کچھ کہہ رہے تھے تم'

'میں کہتا ہوں اسی لمحے میں دیکھو۔''(۲)

بارش اور سیلاب کے بعد غلام باغ کی تباہی کا جائزہ لیتے جب وہ تینوں یعنی کبیر، زہرہ اور ناصر وہاں کا جائزہ لیتے ہوئے ماضی سے حال اور حال سے ماضی میں جھانکیں لگا رہے ہوتے ہیں تو اس موقع پر کبیر ناصر کو اپنی پرانی گفتگو یاد دلاتا ہے جس میں وہ اسی لمحے کی بات کرتا ہے۔اور اسی لمحے میں وہ زمان و مکان کی بات کرتے ہوئے کیا فلسفہ بیان کرتا ہے ذیل کے اقتباس میں ملاحظہ کریں:

''تمہیں یاد ہے ناصر ایک دفعہ میں نے تمہیں اسی لمحے میں دیکھنے کا مشورہ دیا۔یا شاید مطالبہ کیا تھا۔

'شاید حکم دیا تھا' ناصر بولا

.....'آگ اور پانی کے بعد اس مقام اور اس وقت۔اس واقعہ نے اور اس لمحے نے ایک دوسرے کو نیست و نابود کر دیا ہے۔کچھ وقت ہوتا ہے جو مقام کو برباد کر دیتا ہے۔کیفے غلام باغ کے باہر اور اندر میں یہی فرق ہے میں اندر نہیں جانا چاہتا تھا.....''(۳)

ناول کے اختتام پر ڈاکٹر ناصر کبیر کے الفاظ کو دہرا کر قاری کو ایک ذہنی کشمکش میں ڈال دیتا ہے کہ گذشتہ سارے واقعات اسی ایک لمحے میں ہی وقوع پذیر ہوئے جبکہ قاری سمجھ رہا کہ پتہ نہیں کتنا عرصہ گزر گیا ہے۔یوں لگتا ہے وقت کی اضافیت یہاں کارفرما ہے۔جس میں قاری سست رفتار اور واقعات انتہائی تیز رفتار ہیں۔الفاظ ملاحظہ کیجیے:

''میں اب سوچتا ہوں میں ابھی تک اسی لمحے میں دیکھ رہا ہوں جس میں کبیر نے مجھے دیکھنے کا

مشورہ دیا تھا یا شاید حکم دیا تھا۔'وہ گہری لگاوٹ سے ہنسا۔

'کس لمحے میں' زہرہ نے پوچھا۔

'تم ابھی نہیں آئیں تھی اور کینے غلام باغ بھی ہوا کرتا تھا ایسے ہی بہار کی شام تھی مگر ہلکی سی بارش ہو رہی تھی جو اسے بہت تھی پھر اچانک اس نے مجھ سے کہا تھا۔'اسی لمحے میں دیکھو.....'

'اور پھر.....'زہرہ کی آنکھوں میں بے اشتیاق تھا۔

'اور پھر میں دیکھنے لگا اور اسے بتانے لگا پھر میں خاموش ہو گیا مگر پھر بھی اسی لمحے میں دیکھتا رہا مگر شاید بتانا چھوڑ دیا ---یا شاید گم کر دیا---'

زہرہ مسکرائی 'تو تم اسی لمحے سے آزادی چاہتے تھے---'

'اب بھی ہوں--چاہتا ہوں --مگر اب اس لمحے کی قید سے رہائی مجھے تم دے سکتی ہو۔'' (۴)

اسی طرح اس کے برعکس ایک دوسری صورت حال بھی یہاں درپیش ہے۔کبیر مہدی آٹھ دس گھنٹوں کو ایک طویل عرصے میں پھیلانے کی بات کرتا ہے۔وہ یہاں ابدیت کا ذکر بھی کرتا ہے۔کبیر لکھتا ہے:

''اس وقت میرے اندر ایک عجیب تسلسل بھرا ہے۔یہ پچھلے آٹھ دس گھنٹوں کا ہی معاملہ تھا مگر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس مختصر سے زمانے کو ہزار ہا صفحات پر محیط کر سکتا ہوں جیسے ہر دو لمحوں کے درمیان ابدیت حائل ہو گئی ہے۔مگر سرخ بال پوائنٹ پنسل اور نیلے رجسٹر کے بقیہ صفحات محدود امکانات ہیں۔''(۵)

مندرجہ بالا اقتباسات وقت کے متعلق بتاتے ہیں کہ کسی ایک انسان کے نزدیک وقت کیا ہے اور کسی اور کے نزدیک کیا ہے۔ایک فرد ایک ہی لمحے میں سالوں کا نظارہ کر لیتا ہے اور دوسرا فرد انہی سالوں کے ایک ایک لمحہ کو گن گن کر اور سوچ سوچ کر گزارتا ہے۔اس طرح سے اس ناول میں آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کا تذکرہ بھی ہے اور دائروی اور خطی وقت کا بھی،اس کے ساتھ وقت کے وجود سے انکار کی بات بھی ہوتی ہے۔وقت کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے کبیر مہدی کہتا ہے:

''لمحے سے میری مراد کوئی خارجی اور معروضی لمحہ نہیں جس میں تمہارے یہ طرح طرح کے واقعے ہوتے پھرتے ہیں۔پوری کائنات میں ایسا کوئی معروضی لمحہ موجود نہیں جو پوری کائنات پر محیط ہو۔اس صدی کے شروع میں ہی اضافیت کے نظریے نے ثابت کر دیا تھا.....

''ہاں تم وہ کسی لمحے میں 'سوری' اس لمحے میں دیکھنے کی بات کر رہے تھے۔'

'دفع کرو۔'کبیر نے منہ پھلا کر کہا۔

'نہیں پلیز میں سنجیدہ ہوں۔غالباً تم کہنا چاہتے ہو کہ لمحے سے مراد وہ لمحہ نہیں جو گھڑیوں سے ناپا جاتا ہے۔'

'میں یہ کہنا چاہتا ہوں،احمق انسان،کہ وقت کا کوئی وجود نہیں۔یہ محض ایک واہمہ ہے۔''(۶)

وقت کی نفی کے حوالے سے اس ناول کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

''وقت کا کوئی وجود نہیں کائنات ایک بلند مرتبت جھوٹ کے نرغے میں آ گئی ہے۔ ورنہ ایک ہی رات یہ سب کچھ ممکن نہیں۔ اتنا بہت کچھ محال ہے۔ ایک ہی رات اپنی کوکھ میں اتنا کچھ سمیٹ نہیں سکتی۔'' (۷)

اس بحث میں دونوں کردار تردد کا شکار ہو جاتے ہیں کہ وقت کیا ہے۔ مصنف ان الفاظ کے ساتھ اپنے قاری کو بھی Confuse کر دیتا ہے کہ وقت ہے بھی نہیں اگر ہے تو کیا ہے؟ کیسا ہے؟ اور انسان نے وقت کی جو تقسیم کی ہے اس کا کیا مقام و مرتبہ ہے۔ اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے وقت کی انسانی تقسیم کار کے مطابق مصنف ماضی کی اہمیت، حال اور مستقبل کی وضاحت کبیر مہدی کے ذریعے کرتا ہے۔ مرزا اطہر بیگ لکھتے ہیں:

''ماضی محض تاسف ہے یا پھر کبھی کبھار یہ احساس فخر بھی بن جاتا ہے اور مستقبل بس ایک خدشہ ہے یا پھر امید۔ اور یہ چاروں احساس لمحہ حال کے کیپسول میں بند ہیں۔ کیپسول سمجھتے ہو ناں؟' وہ اور بھی جوش سے وقت کے کیپسول کی وضاحت کرنے لگا۔

'لمحہ حال کے کیپسول کے گرد کئی دائروں کا خول ہوتا ہے۔ چھوٹا دائرہ پھر اس سے بڑا دائرہ۔ اور یہ مستقبل قریب سے قریب بعید تک دائرے ہیں جن کے مرکز میں ماضی ہے۔'' (۸)

مرزا اطہر بیگ ایک ماہر استاد کی طرح درجہ بدرجہ انسان کے وقت کی سب سے چھوٹی اکائی لمحہ پر لے کر آتے ہیں اور وقت کی گہرائیوں میں اتارتے ہیں۔ وہ ایک ایک لمحے پر غور و فکر کرتے ہیں اور قاری کو اس کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر کی مثال دے کر وقت کے ایک دورانیے میں انسانوں کی سوچ کی کیا خوبصورت وضاحت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''یہ ڈاکٹر لوگ بھی کیسے خدائی لمحوں کے مزے لوٹتے ہیں۔ جب یہ مریض کی نبض تھامتے ہیں یا اس کی آنکھوں کے پپوٹے اٹھا کر دیکھنا شروع کرتے ہیں یا اس کی دل کی دھڑکن گننے لگتے ہیں تو اردگرد موجود لوگوں کے منہ میں وقت کا ذائقہ ہی بدل جاتا ہے۔ ہر چیز پر ایک گہرے اسرار کی دھند چھا جاتی ہے۔ اور سب کچھ 'پردہ غیب سے کیا ظہور میں آنے والا ہے' کے احساس میں منجمد ہو جاتا ہے، جیسے وقت تھم گیا ہو۔ اب ذرا ان سب کے متوقع جسموں کو دیکھو گہری خاموشی میں مضمحل خیز لیکن جیسے عبادت کر رہے ہوں۔ ان میں سے عاشق علی کے علاوہ شاید کسی کو بھی مدعلی کی زندگی یا موت سے کوئی دلچسپی نہیں ہونے کی خواہش ہر انسان کے اندر موجود ازلی تحیر کے سوتوں کو یک دم کیسے جگا دیتی ہے۔ اور یہ بات بذاتِ خود کتنی حیرت انگیز ہے، اور یہ لمحہ بھی کتنا تحیر خیز ہے۔''(۹)

وقت پر مصنف کی بحث پورے ناول پر چھائی ہوئی ہے۔ ایک نظریہ پیش کرنے کے بعد اگلے صفحات میں مرزا اطہر بیگ قاری کو ایک بار پھر ششدر اور متردد کر دیتے ہیں جب وہ پہلے نظریے کا انکار کر دیتے ہیں۔ راقم کے

خیال میں مذکورہ ناول ایک نئے انداز کا طریقۂ تدریس بھی ہے۔جس میں طالب علم کو ایک نظریہ پر قائل کرنے کے بعد اسی کو یکسر رد کر دیا جاتا ہے اور پھر اُسے غور و فکر کی دعوت دی جاتی ہے۔بہر حال یہ انداز بہت ہی منفرد ہے۔آیئے دیکھتے ہیں کہ مصنف نے اب کیا پینترہ بدلہ ہے۔مصنف کا مہرہ کبیر مہدی کہتا ہے:

''تمہارا وقت قیمتی ہے ڈاکٹر لیکن مجھے بھی ایک اعلان کرنا ہے اور تمہاری موجودگی میں اور ایک بار پھر وقت کے بارے میں۔'اور پھر فوراً ہی اس نے اعلان کرنا شروع کر دیا:'حضرات میں کبیر مہدی ولد مہدی خاں حال ساکن 23 سندر شام روڈ، بڑا شہر اور اصل ساکن قدیمی موضوع سمیال واقع کوہستان نمک بقائمی ہوش و حواس اعلان کرتا ہوں کہ میرا 13 مارچ کا وقت کے کیپسول کا نظریہ محض بکواس تھا۔میں اس سے فی الفور دست بردار رہتا ہوں۔مستقبل نہ تو امید ہے نہ خدشہ بلکہ 13 مارچ کے آخری چند گھنٹوں کے واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ مستقبل محض ایک بلائے ناگہانی ہے،ایک ان دیکھی ابتلا ہے جو غیب سے اچانک انسانوں کے سروں پر نازل ہوتی ہے۔''(۱۰)

روبینہ سلطان غلام باغ کے راوی کے زمانی و مکانی مقام پر تفصیل سے بحث کرتی ہیں۔ایک ہی لمحے میں راوی کے مقام کی تبدیلی خواہ وہ نفسیاتی تبدیلی ہے یا جسمانی اس کا تعلق زمان کے ساتھ ہے۔حال یا ماضی سے مستقبل کی طرف شعوری سفر کرتے راوی اور ناول کے کردار وقت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔روبینہ سلطان اس حوالے سے اپنی کتاب 'تین نئے ناول نگار' میں لکھتی ہیں:

''جب راوی حال سے مستقبل کی طرف اپنا زمانی نقطۂ نظر تبدیل کرتا ہے تو اس وقت سب کچھ قیاس پر مبنی ہوتا ہے۔یہاں راوی کے وقت اور بیان کردہ دنیا کے وقت میں ایک مختلف فاصلہ قائم ہوتا ہے لیکن ان سب میں جو بات مشترک ہے وہ یہ ہے کہ راوی وہ واقعات بیان کر رہا ہے جو ابھی معرض وجود میں نہیں آئے کہ یہ اس کی روایت کرنے کے بعد وجود میں آئیں گے۔ان واقعات میں ایک ابہام چھایا رہتا ہے یعنی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ کیا ہو گا اور اگر یہ واقعات وقوع پذیر ہوئے بھی تو تو یہ بات کون یقین سے کہہ سکتا ہے جس واقع کے بارے میں پیش گوئی کی گئی ہے وہ حرف بہ حرف اسی طرح ہوں گے جس طرح راوی نے بیان کیا ہے۔راوی اپنی کہانی میں اضافیت اور غیر یقینی کا شائبہ ڈالنے کے لیے یہ تکنیک استعمال کرتا ہے اور خود کو ماضی میں کھڑا کر کے قریبی یا درمیانی مستقبل میں کہانی روایت کرتا ہے یہ ایک طرح سے فکشنی کائنات میں اپنی خداصفت قدرت کی نمائش بھی ہے۔مستقبل یا مضارع کے صیغوں کے استعمال سے کہانی واقعات کا ایک سلسلہ بن جاتی ہے۔۔۔راوی کو کہانی بیان کرنے کے لیے ماضی، مستقبل اور حال تینوں صیغوں میں رہ کر کہانی بیان کرنا لازمی ہوتا ہے۔''(۱۱)

حال سے ماضی، ماضی سے حال اور ماضی سے مستقبل میں مختلف کرداروں کی شعوری اور لاشعوری جست یا

بالائے شعور وقت کا سفر ہمیں اس ناول میں نظر آتا ہے،تصور کی آنکھ وقت کا سفر کیسے طے کرتی ہے اس کی مثال کبیر مہدی کی وقت میں تصوراتی اڑان ملاحظہ ہو:

''اس کے تصور کی آنکھ سینکڑوں میل دور کھوہ چٹا سائیں میں جا کھلی تھی' اُس لمحے میں جب میں سانس لیتا یہ سب کچھ سوچتا ہوں وہاں ننگا افلاطون ہے اور سانس لیتا گڑ کھاتا وہ اپنے جسم کا رس کھینچ نکالتا ہے ۔اور مٹی پر اُچھال دیتا ہے'۔کبیر کسی کی طرف دیکھے بغیر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔''(۱۲)

اس کی ایک مثال یاور عطائی کا الٰہیاں صاف کرنے والا رنگو بھائی بھی ہے۔رنگو بھائی نے انگریزوں کے ساتھ کام کیا ہے اور وہ ان کا بڑا دلدادہ ہے۔وہ یاور عطائی کے ڈرائنگ روم میں ہونے والی سرگرمیوں کا راز دان ہے۔یاور عطائی کی آخری محفل میں ہونے والے واقعات اس کے تصور کی آنکھ کے ذریعے دوبارہ زندہ ہو کر نظر آتے ہیں:

''رنگو بھائی کے سال خوردہ ذہن میں جب بھولی بسری یادیں لمحہ حال کے خدشوں سے جڑی گزریں تو کریم بخش نے بیرے کے لیے مشروبات کی ایک اور ٹرے سجاوی اور بیرا بظاہر اونگھتے ہوئے رنگو بھائی کو گہری نظروں سے دیکھتا ٹرے کو اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر متوازن کرتا ڈرائینگ روم میں نمودار ہو گیا۔'' (۱۳)

غلام باغ میں وقت کی اہمیت ،وقت کے نفسیاتی تیر اور وقت کی تقسیم کے حوالے سے اگر کسی نے بات کی ہے تو وہ روبینہ سلطان ہیں ۔انہوں نے حال اور ماضی کے درمیان چکر لگاتے راوی پر تبصرہ کیا ہے ۔ناول کی کہانی ،واقعات ،کرداروں اور راوی کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ناہید سلطان اپنی کتاب 'تین نئے ناول نگار' میں لکھتی ہیں:

''غلام باغ اس اعتبار سے منفرد ناول ہے کہ اس میں نفسیاتی وقت سے زیادہ فائدہ اٹھایا گیا ہے..... واقعات کی ترتیب میں جی بھر کر بے ترتیبی دکھائی ہے لیکن یہ بے ترتیبی کچھ اس طرح ہے کہ قاری اسی کو ٹھیک سمجھتا ہے۔'غلام باغ' میں بیشتر واقعات پہلے وقوع پذیر ہو چکے ہیں لیکن ان کی تفصیل راوی نے بعد میں بیان کی ہے چند واقعات کے علاوہ تقریباً سبھی ماضی میں ہی وقوع پذیر ہوئے ہیں جن کو راوی نے حال میں بیان کیا ہے۔''(۱۴)

مرزا اطہر بیگ اس سوال کا جواب بھی دیتے ہیں کہ انسانی جذبات ،شعور اور وقت کا آپس میں کیا تعلق ہے ۔عشق کے مقامات میں کہیں وقت کارفرما ہے یا نہیں یا یہ کہ وقت عشق سے بالاتر ہے یا عشق وقت سے اعلیٰ ہے ،اور عشق اور وقت لازم و ملزوم ہیں یا نہیں ایک دوسرے کی ضرورت نہیں ۔ڈاکٹر ناصر کے شعور کی رو (جو اپنا وجود تو کہیں اپنے دوستوں میں رکھتا ہے لیکن شعور اس کو کہیں اور بھٹکا رہا ہے) اسے عشق اور وقت کے درمیان چکرائے دے رہی ہے:

''اس کی دوری فنا کا ایک انوکھا احساس ہے جو عشق ہے اور عشق ہستی کے اپنے اپنے زمان و مکان کے درمیان ایک لاخلا ہے جہاں وقت کا وجود محال ہے۔'' (۱۵)

ناول میں زمان و مکاں کے فلسفے کو غیر محسوس طریقے سے بیانیے کا اس طرح سے حصہ بنانا مرزا اطہر بیگ کی اردو ادب کے لیے بہت بڑی خدمت ہے۔غلام باغ میں اختیار کردہ یہ طریقہ کار اردو ادب کی تاریخ میں اپنی انفرادیت کا حامل ہے۔غلام باغ میں وقت کا صرف ایک ہی فلسفہ بیان نہیں کیا گیا بلکہ مختلف تصورات کو مختلف مواقع پر عملی طور پر شامل کیا گیا ہے۔اس ناول میں نظریہ اضافیت اور صوفیانہ تصور وقت کے ساتھ ساتھ دیگر تصورات کو شامل کرنے کا تجربہ کیا گیا ہے۔زمان و مکان کے گنجلک فلسفے کو مصنف ہی الفاظ میں بذریعہ کبیر مہدی مذکورہ ناول میں ملاحظہ فرمائیں:

''س ا واقعہ ق ا۔اور واقعہ ق ۲ دونوں کو معدوم کرتا ہے اور واقعہ ق ۳ ظاہر ہوتا ہے جو نقطہ ج پر ک۔ز۔ن اور گ۔ش کے لامکانی و لازمانی اشتراک کا، لا۔حاصل ہے۔نقطہ ج سے پھوٹتی لکیریں ک۔ز۔ن کے مشترک زمان کی سمت بڑھتی ہیں اور پھر پلٹتی ہیں، ک۔۔۔ز۔۔۔(ماضی) ۔۔۔ک۔۔۔ز۔۔۔مستقبل ک۔۔۔ز (ماضی) ک۔۔۔ن (مستقبل) ۔۔۔ز۔۔۔ن (ماضی) ۔۔۔ز۔۔۔ن (مستقبل)۔لکیریں نقطہ ج سے منتشر ہوتی ہیں اور پیہم نقطہ ج پر ہی مرکوز ہوتی ہیں جو معدوم دورانیے کا لمحہ حال ہے''(۱۶)

صوفیانہ تصور وقت کی عملی شکل کی مثال بھی اس ناول میں موجود ہے۔دعا کرتے ہوئے کوئی بھی شخص زمان و مکان سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔اس کے لیے ماضی، حال اور مستقبل ایک ہو جاتے ہیں۔مصنف کے مطابق دعا وقت کا ہی ایک نظام ہے۔جس میں انسان شعوری طور پر اپنا زمان و مکان تبدیل کر لیتا ہے۔ناول کا ہیرو کبیر مہدی دُعا کے متعلق بات کرتے ہوئے زمان کی وضاحت کرتا ہے۔وہ کہتا ہے:

''دعا کرنا خواہش کرنا ہے اور نامعلوم ہستیوں کے سامنے عجز میں جھک کر وقت کے معمول کے نظام کو فراموش کر دینا ہے۔خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اس نظام کے تابع ہو جاتے ہیں۔کوئی مجھے آج کا کیلنڈر بتائے میں وقت کے بارے میں آج کا نظریہ پیش کرنے والا ہوں۔دعا وقت کا ایک اور نظام ہے''۔(۱۷)

'غلام باغ' اکیسویں صدی کا جدید ناول ہے۔جس میں جدید اسلوب، تکنیک اور فلسفہ کا بیان ہے۔بیانیے کا ایک نیا انداز ہے جس میں راوی بار بار تبدیل ہوتا ہے۔حتیٰ کہ راوی ایک بے جان چیز یعنی نیلا رجسٹر ہے۔غلام باغ آگ کا دریا کے بعد ایک ایسا ضخیم اور کثیر الجہت ناول ہے جس میں وقت کے تصورات پر بحث کی گئی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ زمان و مکان کے جدید و قدیم نظریات کو ادبی انداز میں سمویا گیا ہے۔مرزا اطہر بیگ کے ناول میں وقت کے حوالے سے ابھی تک کم ہی لوگوں نے غور کیا ہے البتہ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے اپنی کتاب 'اردو ناول کے چند اہم زاویے' میں اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''وقت کے حوالے سے محض یہ ہی ایک حقیقت نہیں ہے بلکہ یہ سلسلہ اپنی مسافت میں نا قابل عبور نظر آتا ہے۔اس کا اطلاق ہم مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں 'راکھ' 'قلعہ جنگی' اور 'خس و خاشاک زمانے' مرزا اطہر بیگ کے 'غلام باغ' جسے میں نے ناول آف دی ایبسرڈ قرار دیا تھا وہ ایک پوسٹ ماڈرن ناول ہے۔''(۱۸)

حوالہ جات:

(۱) مرزا اطہر بیگ غلام باغ،ص۳۹۰
(۲) ایضاً،ص۹
(۳) ایضاً،ص۲۶۰
(۴) ایضاً،ص۸۷۵
(۵) ایضاً،ص۴۴۱
(۶) ایضاً،ص۱۱
(۷) ایضاً،ص۵۶۴
(۸) ایضاً،ص۱۲
(۹) ایضاً،ص۲۱،۲۲
(۱۰) ایضاً،ص۳۱،۳۲
(۱۱) روبینہ سلطان،تین فنے ناول نگار،ص۱۶۴
(۱۲) مرزا اطہر بیگ غلام باغ،ص۲۲۷
(۱۳) ایضاً،ص۲۷۶
(۱۴) روبینہ سلطان،تین فنے ناول نگار،ص۱۵۹
(۱۵) مرزا اطہر بیگ غلام باغ،ص۳۲۸
(۱۶) ایضاً،ص۷۳۱
(۱۷) ایضاً،ص۶۰۲،۶۰۳
(۱۸) ڈاکٹر ممتاز احمد خاں،اردو ناول کے چند اہم زاویے،،ص۸۰